اکائی نمبر 15 مرزا محمد ہادی رسوا بحیثیت ناول نگار اور امراؤ جان ادا

ساخت

15.1 اغراض ومقاصد

15.2 تمہید

15.3 مرزا محمد ہادی رسوا کا مختصر تعارف بحیثیت ناول نگار

15.3.1 امراؤ جان ادا ایک تعارف

15.3.2 امراؤ جان ادا اور شاہد رعنا

15.3.3 ناول امراؤ جان ادا کی خصوصیات

15.4 آپ نے کیا سیکھا

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

15.6 سوالات کے جوابات

15.7 فرہنگ

15.8 کتب برائے مطالعہ

15.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- مرزا ہادی رسوا کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے
- مرزا محمد ہادی رسوا کے ناولوں کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے
- مشہور زمانہ اردو ناول امراؤ جان ادا کی فنی خوبیوں سے بحث کریں گے
- اردو ناول نگاری کی تاریخ میں امراؤ جان ادا کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کریں گے

15.2 تمہید

اردو ناول کی تاریخ میں امراؤ جان ادا کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ناول امراؤ جان ادا کا ذکر آتے ہی ناول نگار مرزا محمد ہادی رسوا کی شخصیت ہمارے ذہن کے پردے پر ابھر آتی ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے آبا واجداد کا تعلق ایران سے تھا۔ صدیوں پہلے وہ لوگ ایران سے ہندستان آئے اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ مرزا محمد ہادی رسوا 1857 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا آغا محمد تقی بڑے

باذوق اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ مرزا ہادی رسوا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کے والد عربی، فارسی کے علاوہ علم ریاضی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم ہی کا اثر تھا کہ رسوا نے جہاں ایک طرف عربی، فارسی اور اردو میں لیاقت پیدا کی وہیں علم ریاضی، علم نجوم اور علم کیمیا میں بھی دسترس حاصل کی۔ علم و ادب سے دلچسپی خاندانی وراثت تھی۔

مرزا رسوا کا ناول امراؤ جان ادا مربوط پلاٹ، بے حد دلچسپ کہانی، بہترین کردا نگاری، حسب حال مکالموں، دلچسپ پس منظر اور واضح نقطۂ نظر کے سبب اردو ناول نگاری میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اگر چہ مرزا رسوا نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ ناول نگاری کی طرف توجہ نہیں کی۔ انھوں نے محض روپیہ حاصل کرنے کے لئے ایک ناشر کی فرمائش پر خونی شہزادہ، بہرام کی رہائی، خونی بھید، خونی جورو اور خونی عاشق جیسے جاسوسی ناول لکھے۔ لیکن مرزا رسوا بلا کے ذہین اور فنکارانہ صلاحیت کے مالک تھے۔ افشائے راز، شریف زادہ، ذات شریف اور اختری بیگم جیسے ناول لکھنے کے ساتھ ساتھ مرزا رسوا نے ایک شاہکار ناول 'امراؤ جان ادا' اردو ادب کو دیا۔

امراؤ جان ادا کا موضوع بھی بے حد اہم ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ امراؤ جان ادا کا موضوع طوائف ہے بعض کا اصرار ہے کہ امراؤ جان کا موضوع لکھنو کا معاشرتی زوال ہے۔ دراصل یہ دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ مرزا رسوا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک طوائف کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کے ذریعے پورے معاشرے کی تصویر پیش کر دی ہے۔ ان موضوعات کو قصہ در قصہ رسوا نے اس طرح پیش کیا ہے کہ پلاٹ میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ واقعات ایک دوسرے میں پروئے ہوئے ہیں۔ مرزا رسوا لکھنوی زبان پر قدرت رکھتے تھے اور لکھنوی تہذیب کے پروردہ تھے۔ اس لئے ان کا اسلوب دلکش ہے۔ اپنے کرداروں سے بخوبی واقف تھے اس لئے کرداروں کے تراشنے میں کہیں غلطی نہیں کرتے۔ اور ہر کردار کے عادات اور خصلت سے واقف ہیں اس لئے حسب حال مکالمے لکھے ہیں۔ اور زندگی کے تئیں ان کا جو نظریہ تھا اس میں گومگو کی کیفیت نہ تھی۔ یہی ناول کے وہ عناصر ترکیبی ہیں جن کے خوبصورت امتزاج سے خوبصورت ناول جنم لیتا ہے۔

15.3 مرزا محمد ہادی رسوا کا مختصر تعارف بحیثیت ناول نگار

مرزا محمد ہادی رسوا کے آباواجداد کا تعلق ایران سے تھا۔ صدیوں پہلے وہ لوگ ایران سے ہندوستان آئے اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ مرزا محمد ہادی رسوا 1857ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انکے والد مرزا آغا محمد تقی بڑے باذوق اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ مرزا ہادی رسوا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کے والد عربی، فارسی کے علاوہ علم ریاضی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم ہی کا اثر تھا کہ رسوا نے جہاں ایک طرف عربی، فارسی اور اردو میں لیاقت پیدا کی وہیں علم ریاضی، علم نجوم اور علم کیمیا میں بھی دسترس حاصل کی۔ علم و ادب سے دلچسپی خاندانی وراثت تھی۔ مرزا رسوا ابھی سولہ برس کے تھے کہ انکے والدین کا انتقال ہو گیا۔ انکے والدین بڑی جائداد چھوڑ کر گئے تھے لیکن ان کے ماموں کی نیت ٹھیک نہیں تھی انھوں نے تمام جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ دو چار مکانات ایسے بچے تھے جن پر مرزا ہادی اپنا تصرّف کر سکتے تھے سو انھیں مکانات کی آمدنی پر گزر بسر کرنے لگے۔ کم عمر مرزا ہادی بھلا اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔

مرزا محمد ہادی رسوا علم کے جویا تھے۔ پڑھنے لکھنے میں ان کا دل خوب لگتا تھا۔ اگر چہ لکھنو کا ماحول کچھ اور تھا لیکن مرزا ہادی کو لہو ولعب کا چسکا نہیں لگا اور ان کی ابتدائی زندگی صرف حصولِ علم کا ذوق پورا کرنے میں بسر ہوتی رہی۔ بچپن میں ہی شعر کہنے کا شوق دیکھ کر ان کے والد نے مرزا ہادی کو مشہور مرثیہ گو شاعر مرزا سلامت علی دبیر کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ لیکن مرزا ہادی کی عمر بہت کم تھی اس لئے مرزا دبیر نے انھیں اپنی شاگردی میں رکھنے کے بجائے اپنے صاحب زادے مرزا محمد جعفر اَوج کی شاگردی میں دے دیا۔ مشہور ادبی تاریخ نویس رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

''مرزا رسوا فنِ شعر میں مرزا اوج مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مرزا صاحب جوانی میں مرزا غالب کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور دیوانِ غالب ان کو قریب قریب کل حفظ تھا۔''

شاعری کے علاوہ خوش نویسی کے فن سے بھی مرزا ہادی کو بچپن سے دلچسپی تھی۔ اس فن کے ماہر ایک شیخ صاحب نے مرزا کو خطّاطی کے اسلوب سکھائے۔ اپنے ذاتی شوق کی بنا پر انھوں نے انگریزی زبان پر بھی اچھا عبور حاصل کر لیا۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے رڑکی سے اُورسیری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اُورسیری کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھیں ریلوے میں نوکری مل گئی۔ اور کویٹا (بلوچستان) میں تقرّر عمل میں آیا۔ مگر وہ کام ان کے مزاج کے موافق نہ تھا۔ مرزا ہادی شیخ بوعلی سینا کا ایک رسالہ علم کیمیا سے متعلق پڑھ چکے تھے۔ کویٹا میں ریلوے کی ملازمت کرتے ہوئے ہشام ابن الملک کی ایک کتاب ان کے ہاتھ لگی۔ افلاطون کی لکھی ہوئی ایک کتاب بھی کہیں سے حاصل کر کے پڑھی۔ ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد جو اصول اخذ کئے ان کو عملی شکل دینے پر طبیعت راغب ہوئی۔ یہ رغبت رفتہ رفتہ جنون کی شکل اختیار کر گئی۔ لہذا اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی۔ نوکری سے مستعفی ہو کر لکھنو واپس آ گئے۔ لکھنو کے محلّہ نخاس میں کرائے کا مکان لیکر رہنے لگے۔ کرسچین اسکول میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے۔ مگر اصل مشغلہ کیمیا گری تھا۔ لکھنو میں کئی مکانات بدلے۔ کچھ روز ازابیلا تھابرن کالج میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ ایک سُنار کے لڑکے کو ٹیوشن پڑھانا بھی منظور کیا کہ سونار کے یہاں بھی خالی اوقات میں انھیں کیمیا کے تجربات کے لئے مل جائے۔ ہمہ وقت پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ پڑھنا اور پڑھ کر علم حاصل کرنا ان کے لئے عین مقصدِ حیات تھا۔

کچھ زمانہ حیدر آباد میں ملازمت کی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو مرزا ہادی رسوا بھی ملازم ہوئے۔ لیکن حیدر آباد میں کوئی ادبی شغل نہیں رہتا تھا اس لئے دل نہ لگا۔ واپس لکھنو لوٹ آئے۔ اردو شارٹ ہینڈ اور اردو ٹائپ رائٹنگ انھیں کے دماغ کی پیداوار ہے۔ افلاطون کی کتابوں کے ترجمے انھوں نے کئے۔ ایک یونانی ڈرامے کا بھی ترجمہ کیا جو طلسمِ اسرارِ نو کے نام سے شائع ہوا۔ لکھنو میں ازابیلا تھابرن کالج کی ملازمت ختم ہونے کے بعد آمدنی کم ہو گئی تھی اور اخراجات بڑھ گئے تھے۔ اب کسب معاش کے لئے ناول نویسی اختیار کیا۔ پہلے ہی ناول 'افشائے راز' کی اشاعت نے ناول نویسوں کی فہرست میں بھی ان کو ممتاز جگہ دلوا دی تھی۔ لکھنو کے مشہور ناول فروش بابو مہادیو پرشاد برابر تقاضے کرتے رہتے اور مرزا ہادی ناول پہ ناول لکھ کر دیتے رہے۔ لاتعداد ناول فرضی ناموں سے شائع ہوئے۔ جو ناول خود مرزا کے نام سے چھپے اور ان کی شہرت کا باعث ہوئے ان کے نام تھے 'خونی بھید' 'خونی جورو' 'بہرام کی رہائی' 'ذاتِ شریف' 'شریف زادہ' اور 'امراؤ جان ادا'۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے ایک مختصر علالت کے بعد 21 اکتوبر 1931ء کو حیدر آباد میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔

15.3.1 امراؤ جان ادا ایک تعارف

امراؤ جان ادا مرزا ہادی رسوا کا شاہکار ناول ہے۔ دلچسپ کہانی، مربوط پلاٹ، اعلیٰ کردار نگاری، اور حسبِ حال مکالموں کے سبب یہ ناول ہر خاص و عام میں مقبول ہے۔ پرسی لبک نے ناول کو زندگی کی تصویر یا زندگی کی شبیہ کہا ہے۔ اسکاٹ جیمس اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ناول نگار ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو زندگی کی جیسی ہیں یا زندگی کے مطابق ہیں۔ مرزا رسوا نے اس ناول میں زندگی کو ایسے ہی پیش کیا ہے جیسی وہ ہے۔ اس مقبول عام ناول کے سنِ اشاعت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ 1899 میں ورما برادرس نے اسے شائع کیا۔ ڈاکٹر میمونہ انصاری جنھوں نے مرزا رسوا پر تحقیقی کام کیا ہے ان کے قول کے مطابق بھی یہ ناول 1899 میں شائع ہوا۔ مرزا رسوا کے دوستوں کے بیانات سے بھی یہی سال ثابت ہے۔

امراؤ جان ادا مرزا ہادی رسوا کے بہت اہم ناولوں میں سے ایک ہے۔ اردو میں طوائف پر لکھے گئے ناولوں میں اسے اوّلیت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ امراؤ جان ادا کو ہم علی عباس حسینی کے لفظوں میں محض ایک رنڈی کی کہانی نہیں قرار دے سکتے بلکہ پروفیسر خورشید الاسلام کے لفظوں میں امراؤ جان ادا کا موضوع زوال ہے۔ یہ زوال ایک معاشرہ کا ہے جو اودھ کے چند شہروں میں محدود تھا۔ یہ محض طوائفوں، بگڑے نوابوں، منچلے عاشقوں، اور پیشہ ور غنڈے، بدمعاشوں، عیاشوں کی کہانی نہیں۔ بلکہ یہ اودھ کے زوال پذیر معاشرے کی کہانی ہے۔

امراؤ جان کی کہانی دراصل فیض آباد میں بہو بیگم کے مقبرے پر ملازم جمعدار کی بیٹی امیرن کی کہانی ہے۔ جسے دلاور خان نے لکھنو میں ایک کوٹھے پر لا کر بیچ دیا تھا۔ امراؤ جان کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔ جمعدار کا پڑوسی دلاور خان ڈاکو تھا۔ ایک مرتبہ جمعدار کی گواہی پر اسے سزا ہو گئی تھی۔ تب سے وہ بدلہ لینے کے فراق میں تھا۔ ایک شام اس نے دھوکے سے معصوم امیرن کو اپنے گھر کے اندر بلایا۔ اور اپنے دوست پیر بخش کی مدد سے امیرن کا اغوا کر لیا۔ دلاور خان اور پیر بخش معصوم امیرن کو بیل گاڑی میں ڈال کر لکھنو کی جانب چلے۔ اوّلاً دلاور خان کا ارادہ تھا کہ اس لڑکی امیرن کو قتل کر کے کہیں راستے میں پھینک دیں گے۔ لیکن پیر بخش نے مشورہ دیا کہ اس لڑکی کو قتل کرنے کے بجائے لکھنو چل کے کسی کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اِدھر ڈری سہمی معصوم امیرن بیل گاڑی میں بیٹھی ہے ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی ہیں۔

''دلاور خاں: دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کا پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتا ہے۔

اب کیسا۔۔۔۔ تلملاتا پھرتا ہوگا۔ پیر بخش نے پوچھا: اور اسے کیا کرو گے؟

دلاور خاں جواب دیتا ہے: کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔

راتوں رات گھر چلے چلو۔ پیر بخش: اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ؟

دلاور خاں: گھر چلو، کہیں سے نہ ہو سکا تو کبوتر بیچ کر دوں گا۔ پیر بخش: تم بے عقل ہو۔

کبوتر کیوں بیچو۔ ہم نہ ایک بات بتائیں۔ اماں لکھنو چل کر اس چھوکری کے کوڑے کر لو۔''

اور اس طرح امیرن لکھنؤ میں خانم کے کوٹھے پر فروخت ہوئی۔ یہاں کوٹھے کی مالکن خانم نے کمسن امیرن کو امراؤ کا نام دیا۔ یہی امراؤ پہلے امراؤ جان بنی اور پھر امراؤ جان ادا۔ ننھی جان اور امراؤ جان دونوں اپنے سے بڑی عمر کی طوائفوں کو دیکھ کر ان کی جیسی زندگی گزارنے کا ارمان رکھتی ہیں۔ ننھی جان ہم عمر لڑکوں کی صحبت میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ امراؤ جان کو بھی ہم سن لڑکے کی صحبت میں مزہ آتا ہے۔ ملازم دریافت کرتا ہے کہ ''تخلیے کا وقت کون سا ہے؟'' ناول 'امراؤ جان ادا' میں نواب سلطان کا ایک خدمت گار یہی بات دریافت کرنے کے لئے آتا ہے۔

> ''خدمت گار۔ (سلام کر کے) مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے۔ جو کل شب کو محفل میں زرد مندیل سر پر رکھے دولہا کے داہنی طرف بیٹھے تھے، اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ جس وقت میں آؤں اس وقت کوئی اور نہ ہو، اور اس غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔ میں۔ نواب صاحب سے میری تسلیمات کہنا اور کہنا شام کو جب چاہے تشریف لائیے۔ تخلیہ ہو جائے گا۔''

لکھنو کے ایک مشاعرے میں ہم پہلی دفعہ امراؤ جان سے متعارف ہوتے ہیں۔ مشاعرے ہی میں رسوا سے امراؤ جان ادا کی ملاقات سے کہانی شروع ہوتی ہے۔ اس مشاعرے میں آغا صاحب، خان صاحب، منشی جی، شیخ جی، نواب صاحب، امراؤ جان اور خود مرزا رسوا شریک ہیں۔ مشاعرہ جب اختتام کو پہنچا تو چند احباب ٹھہر گئے۔ ناول میں یوں ذکر ہوا ہے۔

> ''مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فالسہ کی برف جمائی گئی اس کی دو دو قفلیاں احباب نے نوش کیں۔ سب اپنے اپنے مکان تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھا۔ منشی صاحب نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔''

اس مشاعرے میں امراؤ جان ادا نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مقطع تھا:

''کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی''

اس مقطع کے تناظر میں منشی صاحب نے امراؤ جان سے کہا:

''اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دلچسپ ہونگے۔ جب سے آپ نے یہ مقطع پڑھا ہے مجھے یہی خیال ہے۔ اگر آپ اپنی سرگذشت بیان کریں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔''

مرزا رسوا نے بھی منشی صاحب کے بیان کی تائید کی، مگر امراؤ جان پہلو بچاتی رہیں۔ لیکن منشی صاحب کے شوق اور مرزا رسوا کے پیہم اصرار نے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگزشت کہنے پر مجبور ہو گئیں۔ مرزا رسوا کا بیان ہے:

''اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں میں ان سے چھپا کے وہ لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا اس پر امراؤ جان بہت بگڑیں۔ مگر اب کیا ہوتا تھا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔''

فیض آباد سے ایک کمسن لڑکی امیرن کا اغوا ہوتا ہے اور وہ لکھنو میں خانم نام کی ایک طوائف کے ہاتھوں فروخت ہوتی ہے۔ خانم کے کوٹھے کی دنیا امیرن نام کی اس کمسن لڑکی کے لئے ایک بالکل نئی دنیا ہے۔ ابتدا میں خانم اور بوا حسینی سے امیرن کا سابقہ پڑتا ہے۔ بوا حسینی خانم کے کوٹھے پر خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرتے ہوئے امیرن بچپن سے جوانی کی منزل میں پہنچ جاتی ہے۔ خود امراؤ جان کا بیان ہے:

''اسی عرصہ میں میری بھی تعلیم شروع ہوگئی۔ میری طبیعت فنِ موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکّے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے آستائی شروع کرادی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی سر کومل سے ات کومل، سدھ سے اسدھ یا تیور سے تیورتر ہو جائے۔''

15.3.2 امراؤ جان ادا اور شاہد رعنا

مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان اور قاری سرفراز حسین کے ناول شاہد رعنا میں تقابل بھی ایک عام بات ہے۔ دونوں ناولوں میں کچھ مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

''مرزا رسوا کے اس ناول کے بارے میں کئی ناقدین ادب کا خیال ہے کہ رسوا نے امراؤ جان ادا کی ہر بات 'شاہد رعنا' سے اخذ کی ہے۔ 'شاہد رعنا' 1897 میں لکھا گیا۔ جبکہ 'امراؤ جان ادا' شاہد رعنا کے دو سال بعد 1899 میں لکھا گیا۔ 'شاہد رعنا' دراصل ایک طوائف کی خودنوشت ہے۔ 'امراؤ جان ادا' کو بھی ہم ایک طوائف کی آپ بیتی کہہ سکتے ہیں۔ یہ فرق ضرور ہے کہ 'شاہد رعنا' کی ہیروئن ننھی جان ایک طوائف ہی کی اولاد ہے جبکہ امراؤ جان ادا ایک شریف خاندان میں پیدا ہوتی ہے۔''

امراؤ جان ادا کے نواب جس طرح تخلیہ میں ملنا چاہتے ہیں اسی طرح ننھی جان کے نواب بھی تنہائی چاہتے ہیں۔ اس واقعہ کے متعلق قاری سرفراز حسین عزمی 'شاہد رعنا' میں لکھتے ہیں:

''ایک دن دوپہر کو ایک بوڑھا آدمی جو صورت سے کسی امیر کا نوکر معلوم ہوتا تھا کوٹھے پر پوچھتا ہوا آیا.....اماں نے اسے منگوا لیا اور آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ میاں نے دریافت کرایا تھا کہ آپ کے ہاں تخلیہ کا وقت کون سا ہے؟ اماں نے کہا کہ میری طرف سے عرض کر دینا کہ حضور کے لئے ہر وقت تخلیہ ہے۔''

اگرچہ مرزا رسوا نے ہر جگہ اپنے ناول کو ایک نئی صورت دی ہے لیکن پھر بھی جگہ جگہ ان دونوں ناولوں میں مماثلتیں نمایاں ہو ہی جاتی ہیں۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول کو 'شاہد رعنا' سے بہت مختلف صورت دینے کی بڑی ہی کامیاب اور فنکارانہ کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود کئی مقامات پر عزمی کے ناول 'شاہد رعنا' میں پیش کئے گئے واقعات کا سہارا لیا ہے۔ امراؤ جان ادا کو لیکر فیض علی جب کانپور پہنچا اور امراؤ کو ایک مکان میں ٹھہرا کے خود کھانے پینے کو کچھ

لینے گیا اور پلٹ کے نہ آیا تو مجبوراً امراؤ جان باہر نکلی۔ باہر گلی میں ایک مسجد میں ایک مولوی صاحب سے ملتی ہے۔ جس کی تفصیل وہ یوں بیان کرتی ہے۔

''ایک پتلی سی گلی ملی اسی گلی میں ایک مسجد تھی میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے۔ تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، میں درانہ اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے سر منڈا ہوا، ایک نیلی تہمد باندھے ہوئے، دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔''

یہ ہیں مرزا رسوا کے مولوی صاحب جن سے امراؤ جان کانپور کی ایک مسجد میں ملتی ہے۔ اب ذرا قاری سرفراز حسین عزمی کے ناول شاہد رعنا میں اس مولوی صاحب کا حلیہ بھی دیکھ لیں جن سے ننھی جان سونی پت سے دہلی جاتے ہوئے ایک مسجد میں ملتی ہے۔

''میں نے دیکھا مسجد کی دیوار کے پاس نیلا تہمد باندھے نہ کرتہ نہ ٹوپی ایک عجیب الخلقت استنجاء سکھا رہے ہیں۔ ان کا رنگ گندمی تھا، ہاتھ پاؤں صورت شکل سب کچھ خاص تھی مگر منڈھے ہوئے سر نے عجائب گھر کے لائق کر دیا تھا۔''

ناول 'شاہد رعنا' میں مولوی صاحب کا جو حلیہ پیش کیا گیا ہے اس سے مرزا رسوا کے مولوی صاحب کی مشابہت بالکل عیاں ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مرزا رسوا نے ناول شاہد رعنا سے بہت کچھ اخذ کیا ہے، انھوں نے اپنے ناول میں ہر جگہ اپنی جدّت اور فنکارانہ ذہانت سے کام لیکر 'امراؤ جان ادا' کو 'شاہد رعنا' سے مختلف صورت دے دی ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ رسوا کی فن کاری کا راز یہ ہے کہ انھوں نے شاہد رعنا سے واقعات اخذ تو کئے ہیں لیکن ان کو بالکل مختلف انداز سے استعمال کیا ہے اور قاری کو گمان تک بھی نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ 'شاہد رعنا' سے ماخوذ ہے۔

اس ناول میں بعض مقامات پہ اس لئے خامیاں نظر آتی ہیں کہ مرزا رسوا نے اپنے ناول کو جہاں تک ممکن ہو سکا ''شاہد رعنا'' سے الگ اور مختلف بنانے کی کوشش کی ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ ناول نگاری کو انھوں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اپنے کیمیائی تجربات کے لئے انھیں پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے کتب فروشوں کی فرمائش پر ناول لکھ دیتے تھے۔ اگر وہ ناول نگاری کی طرف سنجیدگی سے مائل ہوتے تو یقیناً اردو فکشن کو کئی اور شاہکار ناول ملے ہوتے۔ امراؤ جان ادا میں بعض ایسی کمزوریاں رہ گئی ہیں جنھیں محض ایک نظرِ ثانی سے دور کیا جا سکتا تھا۔ تاریخ ادبِ اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''یہ نہایت اعلیٰ درجے کا ناول ہے اور اس کی عبارت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے جو اردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے کہ اس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصّہ نہایت باقاعدہ اور منظّم اور اس کے کیریکٹر صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ اس میں زمانے کی طرزِ معاشرت اور سوسائٹی کے ہو بہو نقشے کھینچے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا مبالغہ یا آورد نہیں ہے۔''

15.3.3 ناول امراؤ جان ادا کی خصوصیات

کسی ناول پر اظہار کرتے وقت ناقد کی پہلی توجہ اس کے پلاٹ پر صرف ہوتی ہے۔علی عباس حسینی ''ناول کی تاریخ اور تنقید'' میں پلاٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پلاٹ واقعات کے اس خاکے کو کہتے ہیں جو ناول نویس کے پیش نظر شروع ہی سے رہتا ہے۔قصّہ کی ساری دلچسپیاں اسی کی ترتیب پر مبنی ہیں۔اسے جاننا چاہئے کہ وہ کیونکر قصّہ چھیڑے گا۔ اسے قصّہ اس طرح کہنا ہے کہ وہ موثر ہو اور اس مقصد و غرض کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔''

اگر چہ ناول کے اصلی فن کا اظہار تو زندگی کی ترجمانی میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس ترجمانی کے لئے بہتر پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔ پلاٹ کی خوبی دراصل انتخاب پر مبنی ہے اور یہی اس کمال کو پرکھنے کا معیار ہے۔ایک ایک واقعہ کو دیکھتے ہیں کہ اس سے کردار یا نفس قصّہ پر اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ پلاٹ کے لحاظ سے امراؤ جان ادا ایک کامیاب ناول ہے۔ پلاٹ میں جھول نظر نہیں آتا ہے۔واقعات ایک خاص ترتیب سے بیان کئے جاتے ہیں۔

ناول میں پلاٹ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن پلاٹ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کردار نگاری کی ہے۔ کرداروں کے انتخاب سے ہی ناول نگار کے سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔اس ناول میں مرزا رسوا نے امراؤ جان کے ساتھ ساتھ خانم کے کوٹھے کی دیگر طوائفوں کا تعارف بھی فنکارانہ چابکدستی سے کرایا ہے۔ناول میں امراؤ جان ادا کے بعد بسم اللہ جان کا شوخ کردار قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔بسم اللہ جان کوٹھے کی مالکن خانم کی بیٹی ہے اس لئے اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس کے کردار میں زبردست انا بھی ہے۔ وہ مردوں کو بے وقوف بنانا جانتی ہے۔ان سے کھیلتی ہے اور انھیں لوٹتی ہے۔ وہ ایک سفاک بے مروّت معشوقہ عشق پیشہ ہے۔ ایک مکمل طوائف کے تمام اوصاف اس میں موجود ہیں۔خورشید جان کا کردار بسم اللہ کی ضد ہے۔ خورشید کے مزاج میں گھریلو پن ہے۔محبت کی پیاسی خورشید جان طوائف سے زیادہ بیوی بننے کے لئے موزوں ہے۔اس کوٹھے پر نازک نازک سی امیر جان اور بدصورت مگر خوش گلو بیگم جان بھی ہیں۔امراؤ جان خود بیگم جان کا حلیہ کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

> ''خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں، مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔سیاہ جیسے الٹا توا۔اس پر چیچک کے داغ۔لال لال آنکھیں، بھدی ناک، موٹے موٹے ہونٹ، بڑے بڑے دانت، فربہ اندام مگر قیامت کا گلا تھا۔''

اور امیر جان کی صورت گری کچھ یوں کی گئی ہے:

> ''یہی امیر جان اس زمانہ میں ایسی تھیں کہ لوگ ان کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے کہ دو دو مہریاں ساتھ۔ایک گڑگڑی لئے ہے،

ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے، ایک لٹیا لئے، ایک کے پاس خاصدان ہے۔ خدمت گار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑے جاتے ہیں۔''

خانم کے کوٹھے کا پروردہ گوہر مرزا بھی اس ناول کا اہم کردار ہے۔ گوہر مرزا کی آواز بہت اچھی تھی۔ ڈومنی کا لڑکا تھا، قدرتی لے دار۔ وہ بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی۔ رنگ تو کسی قدر سانولا تھا، مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا۔ امراؤ جان کا پہلا پیار وہی ہے۔ گوہر مرزا کا کردار بھی دلچسپ اور پیچیدہ ہے۔ امراؤ جان کی زبانی:

''مرزا صاحب، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہوسکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اس کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا کہیں دو نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں۔ مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلوا سوہن کی ٹکیہ لے آیا۔ مجھ کو کھلا دی۔''

خانم کے کوٹھے پر آنے والوں میں نواب چھبن صاحب، نواب سلطان، خان صاحب، راشد علی، لالہ پنامل، اور فیضو جیسے کردار ہیں۔ ان تمام کرداروں سے رسوا نے ناول کے پلاٹ میں پیچیدگی پیدا کی ہے۔ الجھن اور پیچیدگی سے کہانی میں دلچسپی بڑھتی ہے اور کہانی کا ارتقا ہوتا ہے۔ خانم کا کردار بھی اس ناول میں ایک مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ وہ اس کوٹھے کی مالکن ہے۔ ٹھسّے کی عورت ہے۔ سب کو قابو میں رکھنے کا ہنر جانتی ہے۔ اس کی وضعداری، اس کا سلوک، اس کی دوراندیشی، قابل دید ہے۔ اس کوٹھے پر آنے والوں کے ذریعے مرزا رسوا نے لکھنو کے زوال آمادہ معاشرے کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نواب سلطان جیسے ادب نواز اور خاندانی رئیس خانم کے کوٹھے پر آتے ہیں۔ وہیں خان صاحب جیسے اجڈّ لٹھ مار بھی خانم کے کوٹھے پر پہنچتے ہیں۔ ڈاکو فیض علی بھی کوٹھے پر آنے والوں میں شامل ہے۔ خود امراؤ جان کی زبانی:

''ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پھر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے اور کبھی آدھی رات کو، کبھی پچھلے پہر سے اٹھ کے جاتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں کئی مرتبہ دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہوگئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گزرا ہوگا کہ میرا صندوقچہ سادے اور جڑاؤ گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپیوں کا شمار نہیں اب میرے پاس خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہو گیا تھا۔ اس کو روپیہ پیسہ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایسا دل چاک آدمی نہ میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں۔''

امراؤ جان کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ فیض علی ڈاکو ضرور تھا مگر آدمی سلیقے کا تھا۔ وہ امراؤ جان کو کچھ دنوں کے لئے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے لیکن خانم اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ ادھر امراؤ جان بھی دل ہی دل میں فیض علی کو پسند کرنے لگی تھی۔ فیض علی نے امراؤ جان سے معاملہ طے کرلیا کہ خانم کو بتائے بغیر کسی شب چپکے سے نکل چلتے ہیں۔ اور آخر کار ایک شب امراؤ جان ادا چپکے سے بغیر کسی کو کچھ بتائے خانم کے کوٹھے سے نکل جاتی ہے۔ فیض علی نے بھاگ نکلنے کا سب انتظام کر رکھا تھا۔ لیکن امراؤ کی زندگی میں سکون نہیں لکھا ہے۔ فیض علی سے

ملنا اور مل کر بچھڑنا اس کی قسمت ہے۔ کئی طرح کے حالات سے گزر کر وہ کانپور میں سکونت اختیار کرتی ہے۔ کانپور میں بوا حسینی اس سے ملنے آتی ہیں اور واپس لکھنو لوٹ چلنے کے لئے اسے مناتی ہیں لیکن امراؤ تیار نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کئی نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ ایک بار وہ فیض آباد بھی پہنچ جاتی ہے۔ فیض آباد میں اپنا گھر پہچان لیتی ہے۔ لیکن وہ بھائی جسے وہ بچپن میں اپنی گود میں لئے لئے پھرتی تھی اب اپنی بہن کو گھر میں پناہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ امراؤ جان اب طوائف ہے۔ امراؤ جان ادا آنکھوں میں آنسو بھر کے واپس آجاتی ہے۔ امراؤ تائب ہو جاتی ہے اور کربلا کی زیارت کو جاتی ہے۔ واپس آکر لکھنو میں ایک گھر کرائے پر لیکر سکونت اختیار کرتی ہے۔ جہاں مرزا رسوا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور مرزا کرید کرید کر اس سے اس کی زندگی کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ اس طرح امراؤ جان ادا کی کہانی خود امراؤ جان ادا کی زبانی ناول 'امراؤ جان ادا' کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔

15.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- مرزا محمد ہادی رسوا کے حالات اور ان کے فن کے بارے میں جانکاری حاصل کی
- مرزا محمد ہادی رسوا کے عہد اور ہم عصروں سے واقفیت حاصل کیا
- اردو ناول کی تاریخ سے واقفیت حاصل کی
- ناول امراؤ جان ادا کی ادبی قدر و قیمت سمجھنے کی کوشش کی

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ 'امراؤ جان ادا' اردو کے کس ناول سے ماخوذ ہے؟

2۔ مرزا محمد ہادی رسوا کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

3۔ مرزا محمد ہادی رسوا کون سے علوم جانتے تھے؟

4۔ 'امراؤ جان ادا' کے موضوع پر اظہار خیال کیجئے؟

5۔ 'امراؤ جان ادا' میں رسوا کی کردار نگاری پر روشنی ڈالیے۔

15.6 سوالات کے جواب

1۔ 'امراؤ جان ادا' قاری سرفراز حسین عزمی کے ناول 'شاہد رعنا' سے ماخوذ ہے۔

2۔ مرزا محمد ہادی رسوا 1857 میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔

3۔ مرزا محمد ہادی رسوا کئی زبانیں جانتے تھے۔ وہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں سے خوب واقف تھے۔ ریاضی، اقلیدس، نجوم اور علم کیمیا میں انھیں بے حد دلچسپی تھی۔

4۔ بظاہر امراؤ جان ادا ایک طوائف کی کہانی ہے۔ لیکن یہ ایک زوال آمادہ تہذیب کی کہانی بھی ہے۔ لکھنو اور شرفائے لکھنو کی طرز زندگی بھی اس ناول کا موضوع ہے۔

5۔ اس ناول میں مرکزی کردار امراؤ جان ادا ہی ہے۔ پوری کہانی اسی کے اردگرد گھومتی ہے۔ اس کے علاوہ خانم، بوا حسینی، نواب سلطان، گوہر مرزا، فیض علی، بسم اللہ جان، خورشید وغیرہ اہم کردار ہیں۔ مرزا کے کردار جامد کردار نہیں بلکہ متحرک کردار ہیں۔ مرزا اپنے کرداروں کو اچھا یا برا بنا کر پیش نہیں کرتے۔ جو کردار جیسا ہے اسے ویسا ہی پیش کیا ہے۔ اسی لئے اس ناول کے کردار نا قابل فراموش ہیں۔

15.7 فرہنگ

لفظ	معنی
افشائے راز	راز کا کھلنا، ظاہر ہونا
ماخذ	وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز نکلے، منبع
شاہد	حسین، محبوب
رعنا	انداز سے چلنے والا، خوش خرام، نازک
ہادی	ہدایت کرنے والا، رہنما
خورشید	سورج، آفتاب
اعجاز	معجزہ
سوزِ جحیم	دوزخ کی آگ کی جلن

15.8 کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	2000
2۔ سید احتشام حسین	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	قومی کونسل، نئی دہلی	1997
3۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	لکھنو، یوپی	1962
4۔ ڈاکٹر محمد حسن	ادبی تنقید	لکھنؤ، یوپی	1954
5۔ مرزا رسوا	امراؤ جان ادا	رام نرائن لال بنی مادھو، الہ آباد	1974
6۔ ڈاکٹر محمود الٰہی	(مرتب) خطِ تقدیر	دانش محل لکھنو، یوپی	1965
7۔ سید وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	مکتبہ الفاظ، علی گڑھ، یوپی	1980

8۔ سہیل بخاری — اردو ناول نگاری — ادبستان، لاہور — 1960

9۔ مرزا جعفر حسین — بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں — اُتّر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ — 2004

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY